امتحانی مشق نمبر 2

(یونٹ 5 تا 9)

سوال 1- باغ و بہار کی خصوصیات پر جامع مضمون قلم بند کریں۔ (20)

سوال 2- ناول کی مختلف اقسام پر روشنی ڈالیں۔ (20)

سوال 3- ترقی پسند تحریک نے اردو افسانے پر کیا اثرات مرتب کیے؟ بیان کریں۔ (20)

سوال 4- رپورتاژ نگاری کے آغاز وارتقا پر تفصیلاً لکھیں۔ (20)

سوال 5- سوانح نگاری کی اہمیت وافادیت پر نوٹ لکھیں۔ (20)

ANS 01

باغ و بہار میرامن اصلی نام میر امان اللہ کی طبع زاد تصنیف نہیں- بلکہ بیتسین کی نو مریح سے ماخوذ ہے جو فاری قصہ چھار درویش کا آزادتر جمہ ہے- میرامن نے ڈاکٹر گلکر ائسٹ کی فرمائش پر قصہ چہار در دلیش کو سادہ اور سلیس اردو میں لکھا-

باغ و بہار ایک داستان ہے اور اس میں داستان کی اچھائیاں اور خرابیاں موجود ہیں وہی عام داستانوں جیسی پراسراریت اور مہم جوئی اس میں بھی پائی جاتی ہے - ہیرو جنگل جنگل بھٹکتا اور صحراؤں کی خاک چھانتا ہوا گو ہرمقصود پا لینے میں کا میاب ہو جا تا ہے - مافوق الفطرت عناصر اورنی طاقتوں کی کارفرمائی ہیرو کی کمر در یوں پر پردہ ڈال دیتی ہے - کردار نگاری میں بھی وہی مثالیت پسندی ہے جو عام داستانوں کا خاصہ ہے البتہ نسوانی کرداروں میں کسی قد رزند گی کی حرارت اور نشو ونما کا ثبوت ملتا ہے -مرد کرداروں کی طرح عشق و محبت ان کی فطرت میں بھی داخل ہے اور جنس ان کی سب سے بڑی کمزوری ہے لیکن یا پنی محبت میں انتہا پسند نہیں ہیں - وہ اپنے جذبات پر قابور کھتے ہیں اور جب ان کا نسوانی پندار مجروح ہوتا ہے تو وہ اپنی تو ہین کا بدلہ بھی لینا چاہتے ہیں - بظاہر باغ و بہار وقت گذاری اور دل بہلانے کے لیے لکھی گئی ایک داستان ہے لیکن اس میں اس عہد کی روح سمٹ آئی ہے -

ذکر دنیا کے کسی حصہ کا ہو دہلی کے گلی کوچوں اور جیتے جاگتے انسانوں کی پر چھائیاں موجود رہتی ہیں اس میں جتنے واقعات بیان کئے گئے ہیں یا کر داروں سے جتنی با تیں کہلائی گئی ہیں ان میں - دہلوی تہذیب و معاشرت کی گہری چاپ ہے -اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے یہ کتاب اپنے عہد کی ایک معاشرتی دستاویز بن گئی ہے -

باغ و بہار کی عظمت و مقبولیت کا انحصار اس کے اسلوب نگارش پر ہے -اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے وہ زندہ جاوید ہے اور اس کا شماراردو کی ان کلاسیکی کتابوں میں ہوتا ہے جن

Downloaded From Tajassus.com

سے اردوزبان کو وسیلہ اظہار بنے میں بدلی ہے - باغ بیار کی اس خولی کا اعتراف پرانے اور نئے تمام ہی نقادوں نے کیا ہے۔

باغ و بہار کی جو خصوصیت ہمیں سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ اس کا عوامی اب و لیے اورساوگی وسلاست ہے اس کی اہمیت اس وجہ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ اس زمانے کے عام مذاق میں فارسیت رچی بسی ہوئی تھی اور لوگ کنع اورملی عبارت تشبیہات داستعارات اور تنگینی کام پر جان دیتے تھے - میرامن نے اپنے زمانے کی روایت سے بغاوت کر کے ایسے لب ولہجہ میں اپنی بات کہی جو کسی مخصوص طبقے کے بجائے سب کے لئے قابل فہم تھا اور جس میں پائی جانے والی سلاست ، روانی اور جامعیت اردونثر میں ایک صحت مند اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ میرامن کے اسلوب کی سادگی کا یکمال ہے کہ اس میں کہیں روکھا پن اور سپاٹ پن پید انہیں ہونے پاتا اور اکثر سادگی کے حدود سے نکل کر خوش بیانی کے حدود میں داخل ہو جاتی ہے اور سادگی پر کاری بن جاتی ہے انھیں خوبیوں کی وجہ سے ڈاکٹر احسن فاروقی نے باغ و بہار کی زبان کوتاول کی زبان سے قریب تر قراردیا ہے - روز مرہ اور محاورے کے استعمال میں بھی موقع پل کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ فاری الفاظ کی جبکہ مقامی اور ہندی الفاظ زیادہ استعمال کئے ہیں -کہیں کہیں ایسے الفاظ بھی آگئے ہیں جو خالص بول چال کے ہیں۔ عام تحریر میں کتر استعمال ہوتے ہیں تبھاڑ لینا(تلاش کرنا نہرتا (جھکنا) بجد (بند) مذاخ (مذاق) وغیرہ اسی قبیل کے الفاظ میں لیکن یہ الفاظ اتنے فطری انداز میں استعمال ہوئے ہیں کہ ان سے باغ و بہار کے مجموی حسن و دکشی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی -

میرامن نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ ان کی زبان کی معصومیت اور فطری پن متاثر نہ ہونے پائے -اسی طرح جہاں کہیں قافیہ آرائی کی ہے عبارت میں شعریت اور دلآویزی پیدا ہوگئی ہے۔ یہ قافیہ آرائی مذاق پر گراں نہیں گزرتی اور نہ ہی اس کی وجہ سے انشاء پردازی و افسانہ وی کی دوسری خصوصیات اس کے بوجھ سے دبنے پاتی ہیں -

بعض نقادوں نے باغ و بہار میں متروک تصدیق کی ہے اس کتاب مشکل الفاظ اور متروک الفاظ وغیرہ کافی ملتے ہیں۔ اس کتاب میں میرامن دہلوی نے مشکل الفاظ وہ بھی عربی و فارسی کے استعمال پر گرفت کی ہے - املا اور تذ کیرو تا نبیف کی غلطیوں کی طرف اشارہ کیا ہے اسی طرح جمعرات کی جبکہ جمیرات ،مرضع کی جگہ مر سے‘ نے‘‘ کے بے قاعدہ

Downloaded From Tajassus.com

استعمال اور کر کے کے بجائے کرکر لکھنے کا الزام رکھا ہے - امراؤں ، سلاطینوں اور غر باجیسی خلاف قواعد جمع اجمع بنانے اور گز رانیاں، ہو تیاں کی شکل میں فعل کی جمع استعمال کر نے کی نشاندہی کی ہے -آ ج ہمیں یہ الفاظ یقیناغلط کہتے ہیں لیکن اس زمانے کی بول چال میں یہ الفاظ مروج تھے - لہذا ان کے کرداروں کی زبان پر رواں ہونے کی وجہ سے خودان کے نوک قلم تک آ گئے ہیں-

ANS 02

ناول (Novel) لاطینی لفظ "Novella" سے مشتق ہے، جس کے لغوی معنی نیا، انوکھا اور عجیب کے ہیں-

اصطلاح میں ناول اس طویل نثری افسانے کا نام ہے، جس میں انسانی زندگی کے فرضی واقعات کو فرضی کرداروں کے عمل سے ایک مربوط پلاٹ کے سہارے اس طور پیش کیا جائے کہ وہ واقعات اور کردار سچے معلوم ہوں- ادب میں اس سچائی کو افسانوی صداقت کہا جاتا ہے-

ناول کا کینوس بہت وسیع ہوتا ہے- اس میں زندگی کے حقائق کی ترجمانی سے لے کر انفرادی اور سماجی زندگی، فلسفۂ زندگی اور تنقیدِ زندگی کے پیچیدہ مسائل تک سما جاتے ہیں- ناول، داستان کی ارتقائی شکل ہے-

ناول کی کئی قسمیں ہیں مگر ان میں سے کسی کو بھی ناول کی کسی خاص قسم کا پابند نہیں کیا جاسکتا، تاہم اتنا کہا جاسکتا ہے کہ:

⋆ جن ناولوں میں مقصد یا نظریہ زیادہ ابھرا ہوا ہوتا ہے، انہیں ہم مقصدی یا نظریاتی ناول قرار دے سکتے ہیں-

⋆ جن ناولوں میں پلاٹ پر زیادہ زور ہوتا ہے، یعنی ان میں واقعات کی بھرمار ہوتی ہے، انہیں ہم واقعاتی ناول کہہ سکتے ہیں-

⋆ جو ناول بنیادی طور پر کسی نفسیاتی نقطے کے گرد گھومتے یا پھر کرداروں کی تحلیل نفسی میں مصروفِ عمل ہوتے ہیں، انہیں ہم نفسیاتی ناول کہہ سکتے ہیں-

⋆ جن ناولوں کا مرکزی تأثر کسی خاص کردار کی خصوصیات سے تشکیل پائے، انہیں کرداری ناول سے موسوم کیا جاسکتا ہے-

⋆ جن ناولوں میں تاریخ کسی خاص دور، کسی مشہور شخصیت کو ناول کا موضوع بنایا گیا ہو، انہیں ہم تاریخی ناول قرار دے سکتے ہیں-

⋆ جن ناولوں کی بنیاد انوکھی باتوں، مافوق الفطرت کرداروں اور تحیر و تجسس پر ہو، انہیں ہم جاسوسی ناول کہہ سکتے ہیں-

Downloaded From Tajassus.com

⋆ جو ناول بنیادی طور پر معاشرے کے کسی مسئلے یا مسائل کی نقاب کشائی کرتے ہوں، انہیں معاشرتی ناول کا عنوان دیا جاسکتا ہے۔

ANS 03

ترقی پسند تحریک اردو ادب کی ایک اہم تحریک تھی۔ کوئی بھی تحریک اچانک وارد نہیں ہوجلتی ہے بلکہ اس کے وجود میں آنے میں سماجی، معاشی اور اقتصادی حالات کا دخل ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک لیک عالمی سطح کی تحریک تھی جس کی بہت سی فلسفیانہ اساس ہیں۔ اردو کے بیشتر نقادترقی پسند تحریک کو علی گڑھ تحریک کی توسیع کہتے ہیں۔ ان لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حقیقت نگاری کا جو تصور سرسید احمد خاں کے عہد میں تھا وہ اصلاحی اور تعمیری تحریک کا آغاز تھا۔ ہمارے خیال میں سماجی حقیقت نگاری کا جو تصور سرسید کے عہد میں تھا یہ ترقی پسند تحریک کی حقیقت پسندی سے قدرے مختلف تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ترقی پسند تحریک کو علی گڑھ تحریک کی توسیع کہنے کا کوئی جواز ہے؟ کیا سرسید کے عہد کی حقیقت نگاری، ترقی پسند تحریک کی حقیقت نگاری سے جداگانہ نہیں ہے؟ ظاہر ہے کہ ترقی پسند تحریک نے اجتماعیت، اشتراکیت اور مقصدیت کو اپنے لیے ضروری قرار دیا۔

منشی پریم چند نے حقیقت نگاری کا جو تصور اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے وہ ترقی پسند تحریک کا پیش خیمہ تھا۔ پریم چند کا زمانہ سماجی اور سیاسی اعتبار سے بہت اہم تھا اور یہ دور ترقی پسند تحریک کے لیے بہت ہی کارآمد ثابت ہوا۔ انور سدید لکھتے ہیں:

''یہ زمانہ سماجی اور سیاسی تحریکوں کے لیے اس لیے بھی سازگار تھا کہ عوام اب اپنی جانب دیکھنے پر مائل ہوچکے تھے اور غلامی کا جوا اتارنے پر آمادہ تھے۔ روس کے انقلاب عظیم نے دنیا بھر کے نچلے طبقے کی آنکھیں کھول دی تھیں اور سماجی انصاف اور مساوات ممکن العمل نظر آنے لگے تھے۔ چنانچہ اس دور میں ہندوستان میں جو تحریکیں پیدا ہوئیں اس میں کچلے ہوئے عوام کی طرف زیادہ توجہ ہوئی۔ حقیقت نگاری کی تحریک نے زندگی کے اس بدلتے ہوئے دھارے کو خوردبینی نظر سے دیکھا اور اسے بلاواسطہ موضوعِ ادب بنالیا۔ بیسویں صدی میں اس کی واضح نمود منشی پریم چند کے ادب میں ہوئی۔''1

ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز 1936 سے ہوتا ہے۔ اس سے قبل کے سیاسی اور سماجی منظرنامے معلوم ہوتا ہے کہ 1917 میں جو روس میں انقلاب ہوا اس نے عالمی پیمانے پر سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے غیرمعمولی تبدیلی پیداکی۔ انقلاب روس نے پوری دنیا کے ملکوں کو متاثر کیا۔ اس کی وجہ سے ہندوستان میں عام بیداری پیدا

Downloaded From Tajassus.com

ہوئی۔ اردو ادب میں بھی لنگریزوں کے خلاف ادبا و شعراء اپنے جذبات کا اظہار انیسویں صدی کے نصف آخر میں کرچکے تھے لیکن ترقی پسند تحریک کے زمانے میں معاملہ قدرے مختلف تھا۔ پہلی جنگ عظیم 'فاشزم کا گھناؤنا چہرہ لے کر آئی تھی اور دوسری جنگ عظیم کے بھی آثار نمایاں تھے۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے اس دور کے ادیبوں اور فنکاروں نے غیرمعمولی کارنامہ انجام دیا۔

پیرس میں ایک بین الاقوامی کانفرنس ہوئی جس کانفرنس میں سجاد ظہیر اور ملک راج آنند وغیرہ موجود تھے۔ سجاد ظہیر، ملک راج آنند، پرمود سین گپتا، محمد دین تاثیر وغیرہ نے لندن میں ترقی پسند تحریک کا ایک خاکہ تیار کیا۔ اس طرح لندن میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد پڑگئی اور ہندوستان آنے کے بعد ان ادیبوں نے ہم خیال ادیبوں کو اکٹھا کرنا شروع کیا اور 1936 میں ترقی پسند تحریک کی پہلی کل ہند کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی جس کی صدارت معروف ہندی اور اردو کے فکشن نگار منشی پریم چند نے کی۔ اس پہلی کل ہند ترقی پسند کانفرنس میں ہندوستان کے اہم ادبا اور دانشور شریک تھے۔ پریم چند کا یادگاری خطبہ بہت اہم تھا جس میں ترقی پسند تحریک کے رموز و نکات پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس خطبے کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

''ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔ ابھی تک اس کا معیار امیرانہ اور عیش پرورانہ تھا ہمارا آرٹسٹ امرا کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا انھیں کی قدر دانی پر اس کی ہستی قائم تھی اور انھیں کی خوشیوں اور رنجوں، حسرتوں اور تمناؤں چشمکوں اور رقابتوں کی تشریح و تفسیر آرٹ کا مقصد تھا۔ اس کی نگاہیں محل سراؤں اور بنگلوں کی طرف اٹھتی تھیں۔ جھونپڑے اور کھنڈر اس کے التفات کے قابل نہ تھے۔ انھیں وہ انسانیت کے دامن سے خارج سمجھتا تھا۔ آرٹ نام تھا محدود صورت پرستی کا، الفاظ کی ترکیبوں کا، خیالات کی بندشوں کا زندگی کا کوئی آئیڈیل نہیں زندگی کا کوئی اونچا مقصد نہیں۔'' 2

''جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح بیدار نہ ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قوت و حرارت نہ پیدا ہو، ہمارا جذبہ حسن نہ جاگے، جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لیے سچا استقلال نہ پیدا کرے وہ آج ہمارے لیے بیکار ہے۔ اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔'' 3

''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے۔ سلائے نہیں کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔'' 4

Downloaded From Tajassus.com

منشی پریم چند کا صدارتی خطبہ ایک تاریخ ساز خطبہ تھا۔ جس سے ترقی پسند تحریک کو بہت زیادہ تقویت ملی۔ پریم چند کا یہ صدارتی خطبہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ حقیقی معنوں میں ادب وہی ہے جو زندگی کے مسائل کا ترجمان ہو۔ ادب کے موضوعات کو زندگی کے موضوعات سے بالکل الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے مینی فیسٹو میں اس بات کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے کہ ایسا ادب تخلیق کیا جائے جس میں ظلم و بربریت، غلامی اور سامراجی اقتدار کے خلاف علم بغاوت بلند کرے۔ ترقی پسند ادب کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں آزادی کا جذبہ بھی ہو۔ اس میں انسان دوستی، قومی اتحاد اور حق پرستی کی منزل مقصود تک پہنچنے کی رہنمائی کی گئی ہو۔ علی سردار جعفری ترقی پسند ادب کو عوام کی ملکیت تصور کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''ترقی پسند مصنّفین نے ادب کے اس تاریخی، مادی اور عوامی تصور کو اپنایا ہے۔ ان کے نزدیک ادب نہ تو چند پیٹ بھروں کی میراث ہے اور نہ ذہنی عیاشی کا سامان وہ ادب کو عوام کی ملکیت قرار دیتے ہیں اور اس پر زندگی کے سدھارنے اور سنوارنے کے مقدس فرائض عائد کرتے ہیں اور جدوجہد حیات میں۔ اسے ایک حربے کی طرح استعمال کرنا چاہتے ہیں۔'' 5

اس کل ہند کانفرنس میں بہت سے اہم ادبا و شعرا شریک تھے۔ مولانا حسرت موہانی نے اپنی تقریر میں اشتراکیت کی حمایت کی ہے جو ان کے والہانہ جذبہ کا غماز ہے۔ انھوں نے کہا کہ ''محض ترقی پسندی کافی نہیں ہے۔ جدید ادب کو سوشلزم اور کمیونزم کی بھی تلقین کرنی چاہیے۔ حسرت موہانی نے کہا تھا کہ اسلام اور کمیونزم میں کوئی تضاد نہیں ہے اور انھوں نے پوری دنیا کے مسلمانوں کو اشتراکی نظام کو قبول کرنے کی تلقین بھی کی ہے۔ اس کانفرنس میں فراق گورکھپوری، احمدعلی، محمود الظفر وغیرہ کے مقالے دادِ تحسین کے قابل تھے۔ ان مقالوں میں ترقی پسند تحریک کے مقاصد کو بحسن و خوبی اجاگر کیا گیا ہے۔ ترقی پسند تحریک صرف اردو زبان و ادب تک محدودنہیں تھی۔ ہندوستان کی دوسری زبان و ادب میں بھی اس کا والہانہ استقبال کیا گیا اور ترقی پسند تحریک کی بہت سی شاخیں ہندوستان کے اہم شہروں میں قائم ہوئیں جن میں گوہاٹی، ناگپور، پونا، احمد آباد، میسور، مالابار کا نام قابل ذکر ہے۔

الٰہ آباد میں 1937 میں ترقی پسند تحریک کی ایک اور کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس میں اردو ہندی کے بہت سے دانشور ادبا و شعرا نے شرکت کی۔ کانفرنس میں تیرندر دیو، پنڈت رام نریش ترپاٹھی، مولوی عبدالحق کا نام انتخاب میں آیا اور اس کانفرنس میں

Downloaded From Tajassus.com

مولوی عبدالحق کی شرکت گرچہ نہیں ہوئی لیکن ان کے خطبہ صدارت کو کانفرنس میں پڑھ کر سنایا گیا۔ عبدالحق کے خطبہ سے ایک مختصر اقتباس ملاحظہ ہو:

''ادیب کو حق حاصل ہے اور اسے آزادی حاصل ہونی چاہیے کہ جو چاہے لکھے لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کوبھونڈے پن سے لکھے۔ 'بھونڈے پن' کے لفظ میں ادب کے ظاہر اور باطن دونو ں کی قباحتیں آجاتی ہیں۔ ترقی پسند مصنّفین کو یہ نکتہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ورنہ ان کی بہت سی محنت اکارت جائے گی۔ ان کے خیالات کیسے ہی بلند پایہ اور انقلاب انگیز کیوں نہ ہوں پت جھڑ کی طرح ہوا میں بکھر جائیں گے۔''6

الٰہ آباد میں ترقی پسند تحریک کی ایک دوسری کانفرنس 1938 میں منعقد ہوئی جو ایک یادگاری کانفرنس تھی اس کانفرنس میں یوپی، بہار، پنجاب کے ادیبوں کے علاوہ اردو کے نامور ادبا و شعرا فیض احمد فیض، حیات اللہ انصاری، احتشام حسین وقار عظیم، علی سردار جعفری، آنند نرائن ملا، پریم چند کے بیٹے امرت رائے، عبدالعلیم اور معروف سیاست داں پنڈت جواہر لال نہرو نے تقریریں کیں اور اشتراکیت کی کھل کر تعریف کی اور رابندر ناتھ ٹیگور کا پیغام جو ترقی پسندوں کے نام تھا وہ ادب کی تاریخ میں غیرمعمولی اہمیت کا حامل ہے۔ ذیل کے اقتباس سے رابندر ناتھ ٹیگور کے انقلابی نظریہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

''تخلیق ادب میں تنہائی جتنی مفید ہے اتنی ہی مضر بھی ہے یہ سچ ہے کہ تنہائی میں ادیب اپنے نفس سے ہم گوش ہوتا ہے۔ مطالعے اور مشاہدے کا اصل رمز وہاں ملتا ہے اور دھیان بٹنے کے لیے کسی قسم کا شور و شغف وہاں نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے عزلت پسندی میری طبیعت ثانیہ بن گئی ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سماج سے الگ تھلگ رہنے والا ادیب بنی نوع انسان سے آشنا نہیں ہوسکتا بہت سے لوگوں سے مل کر جو تجربہ حاصل ہوتا ہے الگ رہ کر ادیب اس سے محروم ہوجاتا ہے۔ سماج کو جاننے پہچاننے کے لیے اور اس کی ترقی کی راہ کا پتہ دینے کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ ہم سماج کی نبض پر ہاتھ رکھیں اور اس کے دل کی دھڑکنوں کو سنیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم انسانیت کے غم گسار اور ہمدم ہوجائیں انسان کی روح کو صرف اسی صورت میں ہم پہچان سکتے ہیں۔ ادب اور انسانیت جب باہم ایک دوسرے کے رفیق ہوجائیں گے تو رہنمایان خلق کو مستقبل کی اصل راہ ملے گی اور پھر وہ سمجھیں گے کہ بیداری کا صور کیا ہے اور زمانہ کس نغمے کو سننے کے لیے بے چین ہے۔ اس وقت انھیں عوام کے جذبات کا علم ہوگا ظاہر ہے کہ عوام سے الگ رہ کر ہم بیگانۂ محض رہ جائیں گے۔''7

Downloaded From Tajassus.com

ترقی پسند تحریک کی ترویج و اشاعت کے لیے گاہے بگاہے بہت سی کلنفرنسیں ہوتی رہتی تھیں۔ اس کی تفصیل میں نہ جاتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کے فکری و فنی نظریات پر بھی گفتگو کی جائے۔

سجاد ظہیر اور ان کے رفقا لندن سے فاشزم کے خلاف سوشلزم کا نظریہ لے کر ہندوستان آئے تھے یہ ہندوستانی نوجوان لندن ہی میں کارل مارکس کے اشتراکی فلسفے سے متاثر ہوئے تھے ترقی پسند تحریک کی اولین بنیاد اشتراکیت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لترقی پسند ادیبو ں نے اشتراکیت پر زیادہ زور دیا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے سماج میں معاشی نابرابری کی نکتہ چینی کی ہے۔ ترقی پسند ادب انسان کی معاشی اور اقتصادی آزادی کو اہم مانتا ہے۔ اس کی وجہ سے سماج میں معاشی اور اقتصادی مساوات ممکن ہے۔ ثاقب رزمی کا یہ اقتباس اس امر کی مزید وضاحت کرتا ہے:

''ترقی پسند ادبی تحریک پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ معاشیات کو 'کل' سمجھتی ہے۔ حالانکہ یہ بہتان محض ہے وہ معاشیات کو 'کل' ہرگز نہیں سمجھتی ہے بلکہ انسانی معاشرے کا محور تصور کرتی ہے زندگی کا معاشی پہلو اس لیے اہم ترین ہے کہ استحصالی قوتیں زندگی کے اس پہلو کے ساتھ وابستہ ہیں اور ان ہی قوتوں کی وجہ سے عالمی سطح پر عوام میں معاشی بدحالی اور سماجی قباحتیں پھیلی ہوئی ہیں اس لیے ترقی پسند ادب زندگی کے معاشی پہلو کی آزادی اور مساوات ہی میں انسانیت کی نجات سمجھتا ہے۔'' 8

ترقی پسند تحریک کی دوسری بنیاد اجتماعیت پر تھی۔ ترقی پسند ادیب اپنی تخلیقات میں سماجی زندگی کے مسائل کو پیش کرتا ہے۔ اس کا سروکار عوام کی زندگی کے مسائل سے بہت زیادہ ہے۔ ترقی پسند ادبا و شعرا ان زبانوں کی تشبیہات و استعارات کا استعمال اپنے ادب میں کرتے ہیں جو عوام میں رائج ہوں جس کا تعلق سماجی زندگی سے گہرا ہو۔ ترقی پسند ادیبوں نے اجتماعیت پر زور دیا ہے۔ بعض نقادوں کا کہنا ہے کہ کسی بھی تخلیق کار کی انفرادیت کبھی ختم نہیں ہوتی ہے اور انسان فطری طور پر منفرد ہوتا ہے۔ شارب ردولوی رقمطراز ہیں:

''یہ صحیح ہے کہ سماج ادب کی تخلیق کے لیے کوئی تنظیم یا منصوبہ بندی نہیں کرتا اور مختلف انفرادی کوشش ہی ادب کی تخلیق کرتی ہیں لیکن اس سے یہ مطلب نہیں نکالا جاسکتا کہ سماج سے اس کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا اس سے پہلے یہ بات کہی جاچکی ہے کہ سماج کا اثر شخصیت پر اور شخصیت کا اثر سماج پر پڑتا ہے اس لیے کوئی تخلیق بھی ان اثرات سے علیحدہ نہیں رہ سکتی جو سماجی یا دوسرے لفظوں میں اجتماعی ہیں۔'' 9

Downloaded From Tajassus.com

ANS 04

رپورتاژ نگاری اردو نثر کی جدید ترین صنف ہے، جس میں فنی طور پر علمی مجلسوں ، ادبی محفلوں، سیمیناروں، کانفرنسوں اور اجتماعات کی روداد پیش کی جاتی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ صنف طویل وقت گزر جانے کے بعدبھی ایک تجربہ کا درجہ رکھتی ہے،جس میں افسانوی انداز کی جذباتیت اور غیر افسانوی طرز کی روداد نگاری کار فرما نظر آتی ہے۔ عام طور پر چشم دید واقعات کو خیال آرائی اور زبان کی چاشنی کے ساتھ بیان کرنا رپورتاژ سمجھا جاتا ہے۔ ایک لحاظ سے رپور تاژ میں جہاں واقعہ کا تفصیلی ذکر ہوتا ہے، وہیں احساسات اور تاثرات کو بھی روداد کی شکل میں بیان کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے بیان میں ادبیت اور رومانیت کی روداد ایک جذباتی تصویر کو ابھارتی ہے، اسی خصوصیت کی وجہ سے رپورتاژ ایک غیر افسانوی صنف نثر ہونے کے با وجود افسانوی انداز کی کارفرمائی کے ذریعے اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا۔

رپورتاژ کی پہچان اس کی اپنی ہیئت سے زیادہ اس کے اظہار میں پوشیدہ ہے۔ اس صنف میں کوئی بھی گزرا ہوا واقعہ اظہار کی تہوں تک پہنچتا اور تخلیق کا ر کے اندر چھُپے ہوئے رومانوی احساس کو جگاتا اور پھرمصّورانہ چابکدستی کے ساتھ ایسی تخلیق کو اُجاگر کرتا جو واقعات کی لپیٹ میں مرقع کاری کا درجہ رکھتی ہے۔اسےکوواقعات کی ادبی اور محرکاتی رپورٹ کہہ سکتے ہیں،جس رپورٹ میں تاثرات اور واقعات کی عکاسی ہوتی ہے، جس کی وجہ سے اس صنف میں جذبات اور احساسات کا گزر نہیں ہوتا۔

ان خصوصیات کی وجہ سے رپورٹ کو بہر کیف رپورتاژ سے ایک علیحدہ صنف ہی تصّور کیا جائے گا۔اس میں رپورتاژ نگار عینی شواہد کے طور پر ٹھوس ، صحیح واقعات اور گزرے ہوئے حادثات کا بیان کچھ اس انداز سے کرتا ہے کہ اس کے جذبات اور احساسات کی شمولیت بھی ہوتی ہے اور اسی کارفرمائی کی وجہ سے اس میں اور نامہ نگاری میں فرق پیدا ہوجاتا ہے۔

رپورتاژ میں مخصوص خبر اور جزیات کی شمولیت کی وجہ سے اس کی تخلیقی حیثیت ایک آزاد صنف کی ہوجاتی ہے۔یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بیشتر رپورتاژ نگار اپنے اسلوب میں افسانوی طرز کو شامل کرکے اس صنف کو دلکش اور دلچسپ بنادیتے ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ اردو کے بیشتر رپورتاژ نگار یا تو ناول نویس ہیں یا پھر افسانہ نگار ہیں۔ اسلوب غیر افسانوی نثر سے دور اور افسانوی نثر سے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔

رپورتاژ کا وہ ظاہری ڈھانچہ، جسے بنیاد بنا کر اس صنف کی شناخت ہوسکتی ہے وہی ہیئت طوالت ،ایجاز و اختصار،تاثر اور ہمہ گیری سے مربوط ہے۔کشمکش اور انجام افسانوی نوعیت کا نہیں ہوتا،بلکہ ان پر حقیقت کا گہرا اثر ہونے کی وجہ سے ہیئت اور افسانویت سے استفادے

Downloaded From Tajassus.com

کے باوجود بھی حقیقت پسند اور غیر افسانوی طرز کی نمائندہ ہوتی ہے-اردو میں اس کےمکمل طور پر کامیاب نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہی رہی کہ افسانوی اور غیر افسانوی ہیئت سے واقف قلم کار اردو میں بہت کم ہیں، اسی لیے رپورتاژ نگاری میں افسانویت آگئی ہے-

ساخت،معنی،اور اظہار کے ذریعے کسی فن پارے کا وجود عمل میں آتا ہے،چنانچہ رپورتاژ کی صنف بھی ایک ہیئتی اکائی رکھنے کے باوجود معنی اور اظہار کے معاملے میں افسانوی اور غیر افسانوی دونوں طرز اسلوب سے استفادہ کیا جاتا ہے،جس سے اس کے طرز بیان میں حسن پیدا ہوجاتا ہے-

موزوں اور مناسب الفاظ کے سہارے صحافی اصل واقعے یا حادثے کی رپورٹنگ کرتا ہے -جب کہ رپورتاژ نگار کے لیے لازمی ہے کہ وہ واقعہ کے بیان اور تصویر کشی کے دوران اس قدر ڈوب جائے کہ اس کی شخصیت واقعہ سے منسلک ہوکر واقعہ کے ایک جز کا درجہ حاصل کرلے - اس عمل سے گزرنے کے بعد لکھا جانے والا رپورتاژ ہی حقیقی روداد پیش کرنے کا سبب بن سکتا ہے-

رپورتاژ میں افسانویت کا عمل اظہار کی حد تک روا رکھا جاتا ہے- اس صنف میں افسانویت کا داخل ہوجانا ایک ایسا عمل ہے ،جس کی وجہ سے مواد اور ساخت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ اس کے اظہار میں حسن اور جمالیاتی کشش پیدا ہوجاتی ہے-

کسی حادثہ، واقعہ یا پروگرام کا ظہور پذیر ہونا ایک ایسا عمل ہے جو حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے - واقعہ کو جزئیات کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہے، تاکہ اس صنف کی بنیادی ضرورت کی تکمیل ہوسکے-ترسیل کے لیے اختیار کی جانے والی زبان نہ صرف الفاظ و معانی اور مفہوم کو ادا کرتی ہے بلکہ پیکریت ،ایمائیت یا پھر جمالیاتی احساس کے ذکر کا ذریعہ اظہار بنتی ہے، جس کی وجہ سے ذوق سلیم کی تربیت اور مفہوم کی ادائیگی کا حق ادا ہوتا ہے ہر فن پارہ کے اظہار کے لیے قوّت تحریر اس کی صنفی حیثیت کے لحاظ سے مختلف ہوجاتی ہے-

اس میں ادبیت،صحافت،رومانویت اور افسانویت کا حسین امتزاج ہوتا ہے،جس کی وجہ سے رپورتاژ کی قوّت تحریر اظہار کی تمام ترلذت اور ادبیانداز کی آئینہ دار ہوجاتی ہے-اسی لیے اس صنف میں سوانحی انداز، خاکہ کی کیفیت ،انشائیہ کا درو بست،ڈرامے کی مکالماتی روش کے ساتھ ساتھ سفر نامے کی حقیقت، صحافت کی مبصرانہ شان اور روداد رپورٹنگ کی ہمہ گیری کا ایسا تسلسل پایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے اس صنف میں دیگر نثری اصناف کی جھلکیاں نمایاں ہونے لگتی ہیں-

ANS 05

Downloaded From Tajassus.com

اردو ادب کی دیگر اصناف کے مقابلے میں سوانح عمری کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے۔۱۸۵۷ء سے قبل اردو نثر عہد طفولیت میں تھی۔اسی دور میں سوانح نویسی کا آغاز ہو چکا تھا۔اردو زبان کی یہ خوش قسمتی ہے کہ سر سید کے زمانے ہی سے ہر لحاظ سے مکمل سوانح عمریاں ادب میں وجود میں آ چکی تھیں۔یہ حقیقیت کسی سے پو شیدہ نہیں کہ ہر صنفِ ادب کی طرح سوانح نگاری کے فن میں بھی اردو ادب نے ابتدا میں عربی و فارسی کا تتبع کیا۔ سوانح نگاری کی اہم اور قدیم شاخ سیرت نگاری ہے۔مسلمانوں نے فنِ سوانح نگاری میں سب سے پہلے اسی شعبے کو فروغ دیا۔قدما کے ہاں افراد کے مقابلے میں اجتماعی سوانح نگاری کا رجحان زیادہ رہا۔یہی وجہ ہے کہ پرانے ادب میں تذکرہ نگاری کے فن کو ترقی ملی۔انفرادی سوانح عمریوں میں بادشاہوں کی سوانح جو سوانح سے زیادہ تاریخ معلوم ہوتی۔ یا اولیاء کرام کی سوانح عمریاں لکھی جاتی جن میں سوانح کم اور اولیاء کے معجزات کا بیان زیادہ ملتا ہے۔ اردو ادب میں سوانح نگاروں نے اسی ادب سے فائدہ اٹھایا۔حالی سے قبل اردو ادب میں سوانح نگاری کی مستند روایت نہیں ملتی۔تذکرہ نگاری کی روایت اس سے پہلے موجود تھی جسے مکمل سوانح نگاری نہیں کہا جا سکتا۔سر سید کی تحریک کے تحت ارود میں سوانح نگاری کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ مغربی اثرات کے نفوذ کے بعد اردو ادب میں سوانح نگاری کی ابتدائی کوششوں میں کسی حد تک مناظرانہ رنگ پایا جاتا ہے۔ اردو ادب میںمولانا الطاف حسین حالی ہی وہ شخصیت ہیں جنہیں اردو کے اوّلین نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ اوّلین سوانح نگار ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ان کی سوانح عمریاں خصوصًا''حیاتِ جاوید'' اردو ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔حقیقی معنوں میں یہی اردو کی پہلی با ضابطہ اور باقاعدہ سوانح عمر ی ہے۔حیاتِ جاوید سے پہلے حالی کی تصنیف کردہ دو سوانح عمریاں''حیاتِ سعدی'' اور'' یاد گارِ غالب''منظر عام پر آچکی تھیں۔ان دو کتب کے تالیفی مراحل سے گزرتے ہوئے حالی کا سوانحی شعور ارتقا پذیر رہا۔''حیاتِ جاوید'' میں یہ شعور پہلے سے کہیں پختہ صورت میں سامنے آیا۔اس تصنیف کے سلسلے میں سر سید تحریک کے زیرِ اثر مغربی ادبیات کے محدود مطالعے سے حاصل ہونے والی تحقیقی و تصنیفی سمجھ بوجھ کو کام میں لایا گیا۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی رقم طراز ہیں:

''بلاشبہ حیاتِ جاوید میں خامیاں اور کوتاہیاں موجود ہیں،اس کےباوجود حالی کا ذخیرہ سوانح عمری قابلِ ستائش ہے۔''

حالی کے معاصرین میںسوانح نگاری میں شبلی کا نام اہم ہے۔شبلی کی سوانح نگاری کے حوالے سے یہ بات اہم ہے کہ وہ رسول اکرم ﷺ اور حضرت عمرِ فاروقؓ جیسی مقدس ہستیوں کے سوانح نگار ہیں۔''سیرۃ النبیﷺ ''کے بعد''الفاروق'' شبلی کی بہترین تصنیف ہے اور

Downloaded From Tajassus.com

سوانحی لحاظ سے مکمل اورمفصل ہے۔''الفاروق ''میں شبلی ایک اچھے سوانح نگار بھی ثابت ہوئے ہیں اور ایک اچھے مؤرخ بھی۔ڈاکٹر سید شاہ علی ''الفاروق'' کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ ''حیاتِ جاوید کے بعد جامعیت اور تکمیل وغیرہ کے لحاظ سے اردوکی نو تعمیری اور تجدیدی سوانح عمریوں میں اگر کسی کتاب کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ الفاروق ہے'' حالی و شبلی کے معاصرین میں جن حضرات نے سوانح نگاری کے میدان میں طبع آزمائی کی ان میںذکاء اللہ،نذیر احمد،چراغ علی او رعبد الحلیم شرر وغیرہم کے نام اہم ہیں۔مولوی ذکاء اللہ کی اہم تصانیف میں'' تاریخِ ہندوستان'' جو دس جلدوں پر مشتمل ہے''آئینِ قیصری'' ملکہ وکٹوریہ کی سوانح،شامل ہیں۔ حالی اور شبلی کے بعد آنے والے سوانح نگاروں نے ان دو نوں کی روایت سے فائدہ اٹھایا۔جس کے نتیجے میں اردو ادب کے سوانح عمریوں کے اثاثے میں گراں قدر اضافہ ہوا۔دار المصنفین کے سوانح نگاروں نے حالی و شبلی کی روایت کی آبیاری میں علمی ولولے کے ساتھ حصّہ لیا۔سید سلیمان ندوی نے سیرت النبیﷺ کی تدوین و تکمیل کرنے کے ساتھ ساتھ حیاتِ مالک،سیرتِ عائشہؓاور حیاتِ شبلی لکھ کر سوانح نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا۔افتخارعالم کی''حیات النذیر''اکرام اللہ ندوی کی''وقارِحیات''،رئیس احمد جعفری کی''سیرتِ محمد علی''افضل حسین ثابت کی۔''حیاتِ دبیر''اور قاضی محمد عبد الغفار کی سوانح عمری''آثار جمال الدین افغانی''اس دور کی چند اہم سوانح عمریاں ہیں۔اس دور کی سوانح عمریوں کا سر چشمہ تحریک جذبہ احیائے قومی ہے۔چنانچہ یہ سوانح عمریاں ناموروں کی یادگار کی بجائے قوم کی ترقی کے خیال سے لکھی گئیں۔

بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں تک اردو ادب میں سینکڑوں سوانح عمریاں وجود میں آ چکی تھیں۔غالب کے تعلق سے تین اہم سوانحات،بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میںسامنے آئیں۔غلام رسول مہر کی''غالب'' شیخ محمد اکرم کی سوانح عمری''غالب نامہ''اور مالک رام کی''ذکرِ غالب''۔مالک رام کی تحقیقی کاوش''ذکرِ غالب(۱۹۳۸ء)''اپنے دور اور غالب کی سوانح عمریوں میں قابلِ لحاظ ہے۔بلاشبہ یہ ایک محققانہ،مسرت بخش،مختصر مگر جامع سوانح ہے۔

غلام رسول مہر کی سوانح عمری''سیرت سید احمد شہید''اردو سوانح عمریوں کے سلسلے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔اقبال کی سوانح عمریوں میں ڈاکٹر عبد السلام خورشید کی''سرگزشتِ اقبال''سید نذیر نیازی کی ''دانائے راز''محمد حنیف شاہد کی۔'' مفکرِ پاکستان''اور ڈاکٹر جاوید اقبال کی''زندہ رود'' ارود کے سوانحی ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان کے قومی و ملی ہیروزپر بہت سی سوانح عمریاں چھپیں۔ ان سوانح عمریومیں جہاں بہت سے تاریخی حقائق سے پردہ اٹھتا ہے وہاں ان تخلیقات پر مغربی

Downloaded From Tajassus.com

سوانح نگاروں کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔
سوانح عمری ایک انسان کی پیدائش ،خاندان،تعلیم،مشاغل زندگی اور وفات کا بیان ہی نہیں بلکہ فرد کے ظاہر و باطن،عادات و اطوار،اخلاق و معاشرت،وراثت او نفسیاتی کیفیت اور اس کی زندگی کے نشیب و فراز کی داستان ہے۔اس طرح سوانح عمری سے مراد ہے کہ عہد یا دور،نسل اور ماحول جیسے اثر ڈالنے والنے عوامل کے حوالے سے کسی شخص کی داخلی اور خارجی زندگی کے تمام اہم پہلووں کا ایسا جامع مفصل اور اور معروضی مطالعہ جو اس کی زندگی کے ارتقا اور اس کے ظاہر و باطن کو روشنی میں لا کر اس کی ایک قد آدم اور جیتی جاگتی تصویر پیش کرے۔
سوانح نگاری کے اس مختصر تعریف اور اجمالی ارتقائی سفر کے جائزے کے بعد اگر ہم ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی کی تصنیف کردہ کتاب ''داستان مائل ملیح آبادی''پر گفتگو کریں توہو سکتا ہے کہ آپ ڈاکٹر عصمت کی اس کتاب کو سوانح سے تعبیر کئے جانے پر معترض ہوں۔ اور ہونا بھی چاہئے کیونکہ خود ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی نے اس کتاب کو ''مائل ملیح آبادی کی شعری و ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ لینے والا تحقیقی مقالہ کہا ہے۔ لیکن سوانح نگاری کے اصولوں کے تحت اگر اس کتاب پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ عصمت ملیح آبادی (جوخود ایک افسانہ نگار،شاعر اور تخلیقی تنقید نگار بھی ہیں) نےمائل ملیح آبادی کے فن (شاعری افسانہ اور ناول نگاری) پر گفتگو کرنے سے قبل ،ملیح آباد کی ابتدائی تاریخ،ملیح آباد کی علمی و ادبی فضااورمائل ملیح آبادی کے اسلاف پر گفتگو کی ہے جس کے مطالعہ کے بغیر مائل ملیح آبادی کی شخصیت کی تفہیم ممکن نہیں ہے ۔علاوہ ازیں انھوں نے مائل ملیح آبادی کے حیدرآباد کے سفرکا بھی تذکرہ کیا ہے۔بعدہ مصنف نے مائل ملیح آبادی کے ناول ہی پر گفتگو نہیں کی بلکہ مائل کی شاعرانہ قدر و قیمت کا بھی جائزہ لیا ہے اور ان کی غیر افسانوی نثر نگاری کا بھی ذکر کیا ہے اس طرح سے داستان ملیح آبادی ایک تحقیقی و تنقیدی مقالہ کے ساتھ ہی مائل کی ادبی سوانح کے روپ میں سامنے آتی ہے۔عصمت ملیح آبادی نے اس کتاب میں اپنے والد ماجد مائل ملیح آبادی کی حیات کےہر اس گوشے کو روشن کرنے کی کوشش کی ہے جس کا روشنی میں آنا ضروری تھا۔اور ان کی خدمات کے جن اسرار و رموزپر مصنف نے گفتگو کی ہے وہ انھی کا حق اور حصہ ہے،انھوں نے اپنے والد کو کس طرح دیکھا ہے اس کتاب سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔
مائل ملیح آبادی کے بارے میں باذوق حضرات جانتے ہیں کہ وہ ایک زود نویس ناول نگار تھے انھوں نے تقریبا سو ناول لکھے ۔لیکن یہ کم لوگ جانتے ہین کہ مائل ملیح آبادی نے شاعری بھی کی،افسانے بھی لکھے،صحافت بھی کی اور سیر و سیاحت کا لطف بھی اٹھایا۔ملاحظہ ہو

Downloaded From Tajassus.com

اقتباس:

''مائل ملیح آبادی ایک مستقل مزاج انسان تھے نا مساعد حالات میں بھی ہمت و استحکام و ثبات ان کامزاج تھا۔اپنی پانچ بیتیوں اور تین0 بیٹوں کی تعلیم،شادیاں اور پرورش کے ساتھ ہی انھوں نے سیاسی سرگرمیاں بھی جاری رکھیں ،اور طالب علموں ی تحریکوں مین جیل ہی گئے پولیس کی لاتھیان بھی کھائیں،ناول بھی لکھے،شاعری بھی کی،-صحافت بھی کی،اور فوجداریان بھی کیں،اور سیر و سیاحت کا لطف بھی ٹھایا---وہ تہنائی پسند اور خاموش مزاج انسان تھے،جہلا کی محفل میں خاموش رہتے تھے لیکن جب کسی موضوع پر گفتگو شروع کرتے تو علم کے دریا بہا دیتے۔تاریخ اسلامیات کا طالعہ بہت عمیق تھا۔سیرت کی کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا سیرت ابن ہشام تقریبا حفظ تھی،عزیزوں کے ساتھ روادار ضرورت مندوں کی معاون و مددگار ،پڑوسیوں کے غم گسار تھجے،اپنے باغات اور زمینوں کی اناج اور پھل کا عشر ضرور نکالتے تھے اور فرماتے تھے کہ عشرفصلوں میں برکت پیدا کرتا ہے۔''

مائل ملیح آبادی کا حلیہ بیان کرتے ہوئے عصمت ملیح آبادی لکھتے ہیں:

لانبا قد،سفید رنگت،ہری آنکھین،مولانا آزاد جیسی ڈاڑھی،ہونٹوں پر مسکراہٹ،چہرے پر خاندانی شروفت،وجاہت،زندگی بھر گاؤں کے بلا مقابلہ سرپنچ رہے---مائل صاحب دن بھر کے کاموں سے فارغ ہو کر رات میں لالٹین کی روشنی میں ناول لکھتے ان کا ذریعہ اظہار ناول ہی تھا۔کعبے سے کربلا تک،اپنا گھر،نیا آدمی،آبرو،بازار،یہ زندگی کے میلے،سکھ،معمار،اور پاسبان ان کے بہت مشہور ناول ہیں۔عصمت ملیح آباد کے مطابق مائل ملیح آبادی کی شاعری اور ناولوں ترقی پسند افاکر و خلات ابتدا سے آخر تک کارفرما رہے۔وہ باقاعدہ کمیونسٹ پارٹی کے رکن تھے اور اور زندگی کے آخری لمحات تک سرمایہ دارانہ فکر کے مخالف رہے۔وہ خاکسار تحریک الہند کے قائد بھی تھے''

مائل م،ہیج بادی نے شاعری اور ناول نگاری کے علاوہ تاریخی افسانے بھی لکھے ہیں جو ماہنامہ ''دین دنیا''دہلی میں شائع ہوئےبعد میں ماہنامہ کے مدیر مفتی شوکت علی فہمی نے ان افسانوں کے دو مجموعوں کی ''درا شکوہ کی رقاصہ''اور بہادر شاہ کی کنیز''کی شکل میں نہ صرف شائع کیا۔بلکہ تعارف نامے میں انھوں نے مائل ملیح آبادی کو اس وقت کے ہندوستان کے کہنہ مشق افسانہ نگاروں میں شمار کرتے ہوئے لکھا

''مائل ملیح آبادی ہندوستان کے ایک کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانوں میں روانی بھی ہوتی ہے اور واقعات کا تسلل بھی ہوتا ہے اور رومانی چاشنی بھیمناسب حد تک پائی جاتی ہے۔ان کے افسانوں کی سب سے بری خوبی یہ ہے کہ پڑھنے والا افسانوں میں کھو جاتا ہے اور افسانوی واقعات اس کے سامنے حقیقت بنکر کھڑے ہو جاتے ہیں اور یہ ایسی خوبی ہے کہ

Downloaded From Tajassus.com

جسے بجا طور افسانہ نگاری کا معراج کہا جاسکتا ہے‘‘
چونکہ مصنف مائل ملیح آباد کی فرزند ارجمند ہیں اس لئے یہ گمان غالب تھا کہ مائل ملح آبادی کے فن پر گفگو کرتے وقت مصنف جانبداری کا شکار ہو جائے گا۔لیکن جب ہم کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہےکہ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی نے خود کو کیسے غیر جانبدار رکھا ہے۔شاعری پر گفتگو کی ایک مثال پیش کر کے مضمون ختم کرتا ہوں۔
’’مائل ملیح آبادی نے اپنی شاعری اور زندگی کا تعاراف کراتے ہوئے ۱۹۳۴ سے ۱۹۸۷ کے دوران کہے گئے کلام کے بارے میں لکھا کہ یہ کلام ہندوستان کی سیاسی صورت حال کا دھندلہ سا آئینہ ہے تحریک خلافت کی مدت سے اگر ۱۹۲۴ تک رکھی جائے تو اس وقت میری عمر سات سال تھی پورا خاندان تحریک کے سلسلے میں جیل جا چکا تھا سن ۲۴ سے۳۴ تک شعر کہتا رہا تھا لیکن اس وقت صرف ۳۴ سے بچا کھچا کلام ہی اس مجموعہ میں شامل ہے ۔آگے لکھتے ہیں کہ ۳۷ میں حیدرآباد کا سفر کیا ۳۹ سے ۴۱ تک کلکتے میں رہا۔۴۱ کی تحریک میں روپوشی کے بعد ۴۷ کی آزادی تک مسلم لیگ اور کانگریس کے معرکے جاری رہے۔۴۷ کے بعد ہندو مسلم کے فساد کے خونی معرکے اور سرمایہ دارویکی معاشی گرفت کا دور دورہ رہا۔اگر آپ اس سیاسی سفر کو ذہن میں رکھ کر اس کلام کو پڑھیں تو اس کی اہمیت صرف اتنی نظر آئے گی کہ یہ منتشر خیالات آزادی کی تاریخ کاایک حصہ ہیں اور اسی بنیا د پر یہ لایعنی کلام نہیں بلکہ کلام مستحکم ہے۔
عصمت ملیح آبادی یہاں اپنے والد مائل ملیح بادی سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی غیرجانبدارانہ تنقیدی روئے کا اظہار کرتےہوئے لکھتے ہیں کہ مائل ملیح آبادی جسے کلام مستحکم کہہ کر پیش کر رہے ہیں میں انھیں منتشر خیالات کا مجموعہ تصور کرتا ہوں،کیونکہ افکار و خیالات میں بھی استحکام نہیں ہے اور ترتیب میں بھی انتشار پایا جاتا ہے

Downloaded From Tajassus.com